Fikr-o-Nasar (Islamabad) 46:1,2 (2008)

ہمارے عہد کا ادب اور ادیب☆

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی پچھلے بیس بائیس سال سے ادبی پرچوں میں لکھ رہے ہیں۔ ان کی دو تین چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی چھپ چکی ہیں لیکن ایک ایسی کتاب جس کی مدد سے ان کی تنقید کے بارے میں کوئی رائے قائم کی جا سکے، قمر کتاب گھر کراچی کے ہاتھوں ابھی حال میں ''ہمارے عہد کا ادب اور ادیب'' کے نام سے منظر عام پر آئی ہے۔ کہنے کو تو اس میں مختلف موضوعات پر ادبی مقالات ہیں لیکن قید زمانی نے ان سب کو ایک ایسی لڑی میں پرو دیا ہے کہ یہ مقالات کتابی صورت میں عہد حاضر کی ادبی رفتار و رجحانات کا آئینہ بن گئے ہیں۔ چنانچہ یہ مقالات جہاں اپنے قاری کو الگ الگ انفرادی طور پر متأثر کرتے ہیں وہاں کتابی شکل میں اس کے ذہن پر ایک مجموعی تأثر بھی چھوڑتے ہیں۔ اس مجموعی تأثر کی بناء پر میں کہہ سکتا ہوں کہ کشفی صاحب محض نقاد نہیں، ایک باخبر اور نہایت خوش ذوق و خوش فکر نقاد ہیں۔ ایسے نقاد جو اپنی تنقیدی تحریروں کو ادبی رنگوں سے الگ نہیں ہونے دیتے۔ خوش ذوقی اور خوش فکری کو ہمارے ناقدین نے عام طور پر شاعر یا فن کار کا وصف قرار دیا ہے۔ میرے نزدیک ایک اچھے نقاد میں بھی ان اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔ ان اوصاف کے بغیر تنقیدی تحریر معلومات افزا اور عالمانہ تو ہو سکتی ہے، ادب اور ادیب کی جمالیاتی اقدار کا حقیقی احساس دلانے کا کام انجام نہیں دے سکتی۔ مشکل یہ ہے کہ خوش ذوقی اور خوش فکری کے یہ اوصاف جن کا یکجائی نام ذوقِ سلیم ہے، کالج اور یونیورسٹی میں داخلہ لینے، کتابوں کا بوجھ اٹھائے پھرنے یا لکھنے پڑھنے کی ریاضت و محنت سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ ایک خاص عمر تک ادبی ماحول میں مسلسل تربیت پانے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس تربیت کے بغیر ایک آدمی فلسفی بن سکتا ہے۔ عالم ہو سکتا ہے، سماجیات و اقتصادیات کے مسائل پر مضامین لکھ سکتا ہے۔ ادب و تنقید کے نام پر ڈارون، فرائیڈ اور کارل مارکس کے نظریات و افکار پر لمبی چوڑی بحثیں چھیڑ سکتا ہے لیکن ادب کی تفہیم و تنقید کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اس حق کو ادا کرنے کے لیے وسعت مطالعہ کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کی ذہنی اور ذوقی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی تربیت جو لغات کو بالائے طاق رکھ کر یہ سمجھاتی ہے کہ ادب میں قاتل کے معنی قاتل نہیں محبوب کے ہیں اور رند کو اہل ادب شرابی نہیں، پاکباز و حق شناس کہتے ہیں۔

☆ ماہنامہ قومی زبان، کراچی، اپریل ۱۹۷۳ء

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad.   http://iri.iiu.edu.pk/

مجھے کشفی صاحب کی تحریروں میں اس تربیت کے خاص آثار نظر آتے ہیں۔ یہ آثار ایک خوش گوار ادبی فضا میں دیر تک سانس لینے سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بات میں یونہی نہیں، ذاتی واقفیت کی بناء پر کہہ رہا ہوں۔ اُردو ادب کے قارئین ان کا نام زیادہ سے زیادہ بیس بائیس سال سے جانتے ہوں گے۔ اس لیے کہ ادبی رسائل میں ان کے چھپنے چھپانے کی عمر اس سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن کشفی صاحب اور اُن کے خاندان سے میری واقفیت اس سے بھی پرانی ہے۔ اتنی پرانی کہ پوری تفصیل کے ساتھ اسے ذہن میں ابھارنا بھی مشکل ہے۔

کشفی صاحب کو ننہیال اور دادھیال دونوں جگہ علم و فن کا ایک ایسا خوشگوار ادبی ماحول میسر آیا جو کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ اس ماحول کا تذکرہ کشفی صاحب نے اپنی کتاب میں جا بجا کیا ہے۔ لیکن یہ تذکرہ زیادہ تر ۴۶-۱۹۴۵ء اور اس کے بعد کا ہے جبکہ کشفی صاحب میٹرک پاس کر کے کالج میں داخل ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے کا ذکر ان کی کتاب میں جگہ نہیں پا سکا۔ غالبًا اس کے ذکر کا موقع کسی مضمون میں آیا ہی نہیں۔ ورنہ حق بات یہ ہے کہ ان کے مزاج کو شعر و ادب سے مناسبت اس سے بہت پہلے پیدا ہو چکی تھی۔

کشفی صاحب کے والد حضرت ثاقب کانپوری ایک ممتاز شاعر ہیں اور ان کا شمار اُردو کے اساتذہ فن میں ہوتا ہے۔ ثاقب صاحب کا آبائی وطن کڑا مانکپور ہے لیکن ان کا خاندان ایک عرصے سے کانپور میں آیا ہے اور محلّہ بیگم گنج میں ان کا گھر خانقاہ کے نام سے مشہور ہے۔ مولانا حسرت موہانی کا مستقل قیام بھی موہان کے بجائے کانپور میں رہا لیکن اپنی عمر کا زیادہ حصہ کانپور میں گزارنے کے باوجود کانپوری نہ بن سکے۔ خود کہہ گئے ہیں کہ:

نہ چھوٹا درِ یار حسرت نہ چھوٹا
بہت ہم نے چاہا بنیں کانپوری

لیکن حضرت ثاقب نے خود کو کانپوری ہی لکھنا پسند کیا۔ اس سے انہیں کچھ ملا ہو یا نہ ملا ہو، کانپور کی توقیر ضرور بڑھ گئی۔ پہلے اس شہر کا نام مزدوروں اور صنعت کاروں کے تعلق سے لیا جاتا تھا۔ ثاقب صاحب کی بدولت سے شعر و ادب کی تاریخ میں بھی جگہ مل گئی۔ ممکن ہی نہیں کہ کانپور کی محفل شعر وسخن کا ذکر آئے اور ثاقب صاحب کا نام نہ لیا جائے۔ یا ثاقب صاحب زیربحث آئیں اور کانپور کا ذکر نہ چھڑ جائے۔ وہ آج بھی کانپور کی ادبی محفلوں کی رونق ہیں۔ کل بھی یہ محفلیں انہی کے دم سے گرم رہتی تھیں۔ آج کے بارے میں تو میں تفصیل سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں پہلے کی بعض

باتیں ضرور یاد آ رہی ہیں۔ ان کا اجمالی بیان یوں ضروری ہے کہ کشفی صاحب کی ذہنی و ذوقی تربیت میں ان کا خاصا ہاتھ ہے۔

کانپور میں کشفی صاحب کا گھر حضرت ثاقب کانپوری کے سبب اہل علم اور اہل فن کی توجہ کا مرکز تھا۔ شعر و ادب سے متعلق جو شخص بھی باہر سے آتا وہ مولانا حسرت موہانی اور ثاقب کانپوری سے ملے بغیر نہ جاتا۔ چنانچہ اُردو کا شاید ہی کوئی بڑا شاعر یا ادیب ہو جس کی زیارت وصحبت سے لطف اٹھانے کا موقع کشفی صاحب کو لڑکپن ہی میں نہ مل گیا ہو۔ مجھے ۴۰-۱۹۳۹ء اور اس سے کچھ پیچھے تک کی باتیں اچھی طرح یاد ہیں۔ میں اس وقت ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا اور میری عمر تیرہ چودہ سال کی تھی اور میں لمبی چھٹیوں میں گھومنے پھرنے کانپور جایا کرتا تھا۔ اس وقت کانپور میری نظر میں صحافت ادب کا ایک بڑا مرکز تھا۔ ویانرائن سنگم کا ''زمانہ'' پابندی سے نکلتا تھا۔ ''زمانہ'' سے تو خیر سبھی واقف ہیں لیکن یہ بات شاید سب کو معلوم نہ ہو کہ وہ ایک ہفتہ وار پرچہ ''آزاد'' کے نام سے بھی نکالتے تھے۔ قاضی انعام اللہ کی ادارت میں ''صدائے مسلم'' اخبار نکلتا تھا۔ یہ بند ہوا تو اس کی جگہ ''رہبر'' جاری کیا گیا۔ شوکت بھوپالی ''غریب'' کے نام سے ایک اخبار نکالتے تھے۔ ''ہماری آواز'' کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار احمد حسین باردی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ یہی زمانہ ہے جب کہ اکبر حسین شاکی ناروی ''بیدار'' کے نام سے روزنامہ نکالتے تھے اور ان کا پرچہ خاصا مقبول تھا۔ ماہانہ پرچوں میں ''زمانہ'' کے علاوہ ''مستورات'' اور ''الادب'' بھی قابل ذکر ہیں۔ ''مستورات'' بلقیس بیگم نکالتی تھیں اور ''الادب، شارق ایرایانی کی ادارت میں نکلتا تھا۔ چھ مہینے کے بعد بند ہو گیا۔ ان میں سے ہر پرچے میں ثاقب صاحب کی کوئی نہ کوئی چیز چھپتی تھی اور بعض کی مجلس مشاورت میں بھی اُن کا نام ہوتا تھا۔

یہ سارے پرچے مجھے کیسے پڑھنے کو ملتے تھے، اس کا ذکر بھی مختصراً سن لیجئے۔ میرے بہنوئی اور بڑے بھائی بسلسلہ ملازمت کانپور میں تھے۔ بڑے بھائی شمشاد علی شعر بھی کہتے تھے اور تنہا تخلص کرتے تھے۔ ثاقب کانپوری کے مکان کے قریب ہی کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ اس وقت پرانوں میں حسرت موہانی، ناطق لکھنوی، وحشی کانپوری، شارق ایرایانی، مصطفٰی حسین نیر، وفا کانپوری اور منشی اکرام اللہ اکرم وغیرہ کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا۔ نشور واحدی بھی خاصے مشہور ہو چکے تھے۔ کوثر جائسی، فنا کانپوری اور پیام فتح پوری تیزی سے شہرت کی طرف قدم آگے بڑھا رہے تھے۔ کانپور کے طرحی اور غیر طرحی مشاعروں کی رونق ان سب کے دم قدم سے قائم تھی۔ ان میں سے بعض کا میرے وطن قدیم فتح پور سے گہرا تعلق تھا۔ فتح پور مولانا حسرت موہانی کا ننھیال ہی نہیں بلکہ ان کی تعلیم و تربیت کا

گہوارہ بھی تھا۔ یہاں انہوں نے اپنی عمر کے پورے بیس سال گزارے تھے۔ وحشی کانپوری کا اصل نام کرشن سہائے تھا۔ اُردو فارسی کے فاضل تھے اور بہت اچھا کہتے تھے۔ نورجہاں کے عنوان سے ان کی ایک نظم خاصی مقبول ہوئی تھی۔ شعر کی داد اس انداز سے دیتے تھے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ جیسا کہ پرنسپل عبدالشکور مرحوم نے اپنی کتاب ''اردو کے ہندو شعراء'' میں تفصیل سے لکھا ہے۔ وحشی صاحب کا اصل وطن فتح پور ہسوہ تھا۔ وکالت کی غرض سے کانپور گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ ان کا تعلق فتح پور کے اس مشہور کائستھ خاندان سے تھا جس میں فراق گورکھپوری کی دو بہنیں بیاہی ہیں۔ شارق ایرایانی بھی حیات ہیں۔ پینسٹھ ستر کی لپیٹ میں ہوں گے۔ ان کا تعلق فتح پور ہسوہ کے مشہور قصبہ ایرایاں سے ہے اور وہ اسی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ ایرایانی لکھتے ہیں۔ ان کا اصل نام سید صفدر علی ہے۔ شارق تخلص کرتے تھے۔ میرے ننہیالی مکان سے ان کا آبائی مکان ملا ہوا ہے۔ میرے بہت قریبی عزیز ہیں۔ اس وقت ان کا شمار کانپور کے اساتذہ فن میں ہوتا تھا۔ نظم و غزل خوب کہتے تھے لیکن شعر پڑھنا بالکل نہ آتا تھا۔ تحت اللفظ بھی بہت خراب پڑھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ شہرت نہ پا سکے۔ ان کے بعض شاگرد و غیر شاگرد جو ان سے لکھوا کر پڑھتے تھے آواز کی بناء پر ان سے زیادہ مشہور ہو گئے تھے۔ گزشتہ کئی برسوں سے عشق رسولؐ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور بڑی پاکیزہ نعتیں کہتے ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام اب تک شائع نہیں ہوا لیکن وہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کے کلام کا تعارف کرایا جائے۔ یہ کام کشفی صاحب ہی انجام دے سکتے ہیں اور یقین ہے کہ وہ ان کا ذکر بھی کبھی کسی مضمون میں چھیڑیں گے۔

منشی اکرام اللہ بھی کشفی صاحب کو ضرور یاد ہوں گے۔ نہ سانولے تھے نہ کالے، دبلے پتلے، لمبے قد کے آدمی تھے۔ شیروانی اور چوڑی مہری کا پائجامہ پہنتے تھے۔ منشیانہ چشمہ لگاتے تھے۔ ان کا تعلق میرے آبائی گاؤں ہیبت پور سے تھا۔ میرے بہنوئی اور بڑے بھائی کے ساتھ ہیرا من پورہ میں بابو حمزہ کی کوٹھی کے پاس رہتے تھے۔ اپنے وقت کے ممتاز خطاطوں میں سے اور اُردو فارسی دونوں میں شعر گوئی کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ پہلے وحشی تخلص کرتے تھے بعد کو اکرم لکھنے لگے تھے۔ کبھی کبھی گاؤں آ جاتے تھے تو ہفتوں قیام کرتے تھے۔ کانپور کے سارے اخبار و رسائل ڈاک کے ذریعے سے انہیں پابندی سے پہنچتے تھے اور مجھے بھی پڑھنے کو ملتے تھے۔ ان کی غزلیں اس زمانے کے اکثر رسالوں میں نظر آتی ہیں۔ ان کے یہ دو شعر اب تک مجھے یاد ہیں:

روح لطیف میری وقف زیاں نہیں ہے
وہ پھول ہوں کہ جس کو فکر خزاں نہیں ہے

آئے کہاں سے اکرم رنگینیٔ محبت
کیا لطف شاعری جب شاعر جواں نہیں ہے

انہی کی معرفت مجھے حضرت ثاقب کا مجموعہ کلام ''متاع درد'' پڑھنے کو ملا تھا۔ عمدہ کاغذ پر خوب صورت جلد اور ثاقب صاحب کی تصویر کے ساتھ تازہ تازہ چھپ کر آیا تھا۔ میں نے اسے بڑے ذوق و شوق سے پڑھا تھا اور کچھ اشعار بھی منتخب کیے تھے۔ میرے بڑے بھائی سیّد شمشاد علی تنہا کو شعر گوئی کا چسکا منشی اکرم اللہ کی صحبت میں لگا تھا۔ لڑکپن میں مجھے انہی دونوں کی ہمراہی میں ثاقب صاحب کی زیارت اور بعض دوسری ادبی نشستوں میں خاموش تماشائی کی حیثیت سے شرکت کا موقع میسر آتا تھا۔ اس وقت کشفی صاحب کو یہ خیال ہوگا کہ وہ کسی وقت اُردو کے ممتاز ادیب بن جائیں گے اور نہ میں یہ سوچ سکتا تھا کہ کبھی مجھے اس ساری داستان کو سنانے کا موقع مل جائے گا لیکن اب غور کرتا ہوں تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ ان بزرگوں سے ہمیں لاشعوری طور پر جو کچھ ملا ہے وہ اس سے کہیں قیمتی اور اہم ہے جو ہم نے شعوری طور پر حاصل کیا ہے۔

کشفی صاحب کی تربیت ذہنی کی داستان یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں ننہیال سے بھی انہیں بہت کچھ ملا ہے۔ کشفی صاحب کا ننہیال فتح پور ہسوہ کے ایک سیّد خاندان میں تھا۔ فتح پور ہسوہ چھوٹا سا شہر ہے، اس کی مسلم آبادی دو تین محلوں میں سمٹی ہوئی ہے۔ اس آبادی کا تہذیبی و تعلیمی مرکز مدرسہ اسلامیہ فتح پوری یعنی مسلم انٹر کالج ہے۔ شروع ہی سے اس مدرسے کے دو شعبے ہیں، ایک دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہے، دوسرے کا تعلق مروجہ سرکاری نظام تعلیم سے ہے۔ اسے ندوۃ العلماء کے گمنام بانی مولانا سیّد ظہور الاسلام نے ۱۸۸۲ء میں دینی اور دنیوی دونوں کی یکجائی تعلیم کے لیے قائم کیا تھا۔ مولانا حسرت موہانی، مولانا نیاز فتح پوری، مولانا عبدالرزاق کانپوری، مولانا بدیع الزماں خان، مولوی حبیب الدین، مولانا حسن الدین خاموش،مولوی حکیم عبدالحی، مولانا عارف ہسوی، مولوی فضل امام اور بعض دوسرے اکابر علم و ادب نے اسی مدرسے میں تعلیم و تربیت پائی ہے۔ اس مدرسے اور مدرسے کے بانی کے طفیل فتح پور ہسوہ، میرے زمانہ طالب علمی تک ادبی مشغلوں کا چھوٹا سا مرکز تھا۔ ان مشغلوں میں سب سے زیادہ مقبول و محبوب شعر و شاعری تھی۔ پرانے رنگ کے استادوں میں سفیر فتح پوری ابراہیم ہندی، فاروق شاہ پوری، عبدالحمید برق، عطا حسین عطار وغیرہ حیات تھے لیکن شاعر کی حیثیت سے سب سے ممتاز نام سیّد علی اوسط رشک کا تھا۔ ان کا کلام بیسویں صدی کی پہلی چار دہائیوں کے درمیان اکثر رسائل میں شائع ہوا ہے۔ بقول صاحب خمخانہ جاوید ان کا سلسلہ تلمذ حضرت ناسخ لکھنوی سے ملتا تھا۔ سیّد علی اوسط رشک کشفی صاحب کے رشتے کے نانا تھے۔ کشفی صاحب

فتح پور آتے تھے تو انھی کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ رشک صاحب کو فتح پور میں وہی مقام حاصل تھا جو کانپور میں حضرت ثاقب کانپوری کو۔ رشک صاحب کے مکان سے ملحق مولانا حسن الدین خاموش کا گھر اور ''خاموش پریس'' تھا۔ خاموش صاحب کا ہفتہ وار اخبار ''دلچسپ'' اس پریس سے شائع ہوتا تھا۔ میں نے ان سارے بزرگوں کو دیکھا ہے۔ یہ سب کشفی صاحب کے ننھیالی عزیز تھے اور ان کی صحبتوں نے بچپن اور لڑکپن میں کشفی صاحب کے ذہن و طبیعت پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس اثر کے نتیجے میں جب وہ اسکول اور کالج میں داخل ہوئے تو ان کی ادبی صلاحیتوں کو بروئے کار آنے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگی۔ سو دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنے ساتھیوں اور استادوں کی توجہ کا مرکز بن گئے۔

یہ ساری باتیں اس وقت کی ہیں جب ہم دونوں کا ''مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تھا''۔ صرف ۴۵-۱۹۴۴ء اور اس کے بعد کی باتیں ایسی ہیں جو ہم دونوں کو پوری جزئیات کے ساتھ یاد ہیں۔ ایک ملاقات تو ایسی ہے جو میری ادبی زندگی میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔ پروفیسر کلیم الدین احمد کی۔ اُردو شاعری پر ایک نظر'' اور اُردو تنقید پر ایک نظر'' کو منظرعام پر آئے ہوئے زیادہ وقت نہ گزرا تھا۔ یہ کتابیں اس زمانے کے سارے ادبی حلقوں میں موضوع سخن بنی ہوئی تھیں۔ ہر طرف انھی کا چرچا تھا۔ چھوٹے بڑے سب کلیم الدین سے برہم تھے۔ برہم کیوں نہ ہوتے۔ مولانا حالی نے تو صرف لکھنو اور اہل لکھنو پر وار کیا تھا۔ کلیم الدین احمد نے اپنے والد ماجد عظیم الدین کے سوا کسی کو نہ چھوڑا تھا۔ ایک طرح سے سب پر کند چھری پھیر دی تھی۔ تاریخ یاد نہیں ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء کا سال تھا۔ رشید احمد صدیقی نے کلیم الدین احمد کی کتابوں کو دیکھ کر طنزاً برجستہ سودا کا یہ شعر پڑھا تھا۔ ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

کشفی صاحب گھومتے پھرتے فتح پور آئے اور اُردو شاعری پر ایک نظر'' مجھے پڑھنے کو دے گئے۔ اس کتاب کے مطالعے نے دوسروں کی طرح مجھے بھی چونکا دیا یا اور برہم کیا۔ اس وقت میں صرف شعر کہتا تھا لیکن ایسا غصہ آیا کہ ایک طویل مضمون کلیم الدین احمد صاحب کی مخالفت میں لکھ مارا۔ یہ میرا پہلا مضمون تھا۔ شائع کیا ہوتا اور کون شائع کرتا، شائع کرنے کے لائق ہی نہ تھا لیکن عمر بھر یاد اس لیے رہے گا کہ اسی مضمون کے توسط سے میں شاعری سے نثر کی طرف آیا ہوں۔

یہی زمانہ قیامِ پاکستان کی جدوجہد، مسلم لیگ اور کانگریس کی معرکہ آرائیوں اور سیاسی ہنگاموں کا ہے۔ حسن احمد شاہ جو اس وقت حیدر آباد سندھ کے ممتاز وکیل اور سیاسی رہنما ہیں، اس وقت کانپور

میں تھے۔ مسلم لیگ کے حد درجہ سنجیدہ اور دیانتدار کارکن تھے۔ ان کا آبائی وطن بھی کوڑا جہاں آباد ضلع فتح پور ہسوہ تھا۔ میرے اور کشفی صاحب دونوں کے عزیز ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ عزیزوں میں بھی عزیز تر ہیں۔ ان کی بزرگانہ شفقتیں اور لطف ارزانیاں اپنے عزیزوں‌اور چھوٹوں پر آج بھی ہیں اور پہلے بھی تھیں۔ مسلم لیگ نے صوبائی اسمبلی کے لیے انہیں فتح پور ہسوہ کے علاقے سے انتخابی ٹکٹ دیا تھا۔ میں ان کی انتخابی مہم کے سلسلے میں کئی مہینے ان کے ساتھ جا بجا الٹی سیدھی تقریریں کرتا پھرا ہوں۔ کانپور اور فتح پور کا فاصلہ ہی کتنا تھا جیسے کراچی سے حیدر آباد آنا جانا لگا رہتا تھا۔ میرے جاننے والوں میں کشفی صاحب کے علاوہ سرشار صدیقی، اشتیاق حسین اظہر، حسنین کاظمی، مرتضی شفیع اور سراج احمد ادیب سب کی اٹھتی جوانیاں تھیں اور کچھ نہ کچھ ہنگامہ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

کشفی صاحب کو تقریر اور تحریر دونوں کا شوق شروع ہی سے ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ دونوں میں وہ اپنی دھاک بٹھا لیتے ہیں لیکن ان کی تقریر سے زیادہ میں ان کے اندازِ تحریر کا قائل رہا ہوں۔ وہ نثر کے بارے میں کچھ لکھیں یا نظم کے مسائل پر قلم اٹھائیں یا افکار پر سب سے ان کی طباعی و ذہانت کا رنگ جھلک پڑتا ہے۔ موضوع کتنا ہی بے جان، خشک اور فرسودہ کیوں نہ ہو کشفی صاحب کا قلم اس میں شگفتگی و تازگی کے آثار پیدا کر دیتا ہے۔ پھر یہ بھی نہیں کہ جس موضوع پر لکھنے جا رہے ہیں پہلے اس کے اشارات مرتب کر لیں، کوئی خاکہ بنا لیں۔ حوالے اور اقتباسات سامنے رکھ لیں۔ رک رک کر قلم چلائیں۔ کانٹ چھانٹ سے کام لیں، یہ کچھ نہیں کشفی صاحب عام طور پر بے ساختہ اور بے تکان لکھتے ہیں۔ تیزی سے قلم چلاتے ہیں اور جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں زیادہ تر ایک ہی نشست میں لکھ لیتے ہیں لیکن کیا مجال کہ ان کی تحریر میں کہیں سے جھول آ جائے۔ گہرائی زیادہ ہو یا نہ ہو گیرائی سے خالی نہیں ہوتی۔ ان کی اس تیزیٔ تحریر اور خوبیٔ قلم سے سبھی واقف ہیں۔ اس لیے اپنا کام نکالنے کے لیے بہت سے لوگ ان کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔ شعبے میں ان کا کمرہ میرے کمرے سے ملا ہوا ہے۔ میں یہ تماشا بیٹھے دیکھا کرتا ہوں کہ کوئی ان سے خطبہ صدارت لکھوانے چلا آ رہا ہے کوئی سپاسنامہ درست کرانے کی فکر میں ہے۔ کوئی تقریر کا خاکہ بنوانے کے لیے کمرے کے باہر ان کے انتظار میں کھڑا ہے۔ کوئی اپنے مضمون پر نظرثانی کے لیے انہیں ڈھونڈ رہا ہے۔ کوئی کسی انگریزی کتاب کے اُردو ترجمے کی نوک پلک درست کرانے کے لیے دوڑ لگا رہا ہے۔ کوئی دعوت نامہ اور اشتہار کا مضمون بنوانے کے لیے زینے پر ان کا منتظر ہے۔ کوئی فارسی سے اُردو میں کچھ ترجمہ کرانے آیا تھا۔ کمرے کا طواف کر کے واپس جا رہا ہے اور کوئی منہ سے کچھ نہیں بتاتا لیکن ہاتھ میں کاغذ کا پلندہ لیے روزانہ آتا ضرور ہے۔ صبح سے دوپہر تک یہی منظر رہتا ہے۔ کشفی صاحب اخلاقاً وعدہ سب

سے کر لیتے ہیں لیکن بڑی مشکل سے پکڑے ملتے ہیں پھر بھی وقت پر نہ سہی دیر سویر سہی، کام سب کا ہو جاتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ کشفی صاحب ہاتھ لگ جائیں۔ لوگ ان کی اس کمزوری سے واقف ہیں، اس لیے پکڑ ہی لیتے ہیں۔ میں نے کشفی صاحب کی ان باتوں کو نہ اخلاقی نقطہ نظر سے کبھی سراہا نہ علمی و ادبی نقطہ نظر سے کبھی پسند کیا اور ہمیشہ ان سے شکایت کی۔ اوّل اس لیے کہ اس قسم کی تحریریں ضائع کرنے کے لیے لکھوائی جاتی تھیں۔ دوسرے اس سے ان کے وقت، اور ان کی ذہانت دونوں کا زیاں ہوتا تھا۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ کشفی صاحب کو پچھلے کچھ دنوں سے اس زیاں کا احساس ہو چلا ہے۔ اس احساس کا ثبوت ان کی تازہ کتاب ''ہمارے عہد کا ادب اور ادیب'' ہے۔

کتاب کے نام کی مناسبت سے کشفی صاحب نے اس میں صرف تنقیدی مقالات کو جگہ دی ہے جن کا تعلق عہد حاضر کے اردو ادب سے ہے۔ یہ مقالات ادب کی کسی ایک صنف یا موضوع تک محدود نہیں ہیں بلکہ نثر و نظم کے متعدد پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان میں اصناف، اشخاص اور مسائل سبھی زیر بحث آئے ہیں۔ ادبی مسائل و اصناف کے ذیل میں تین مقالے ہیں۔ سب سے اہم مقالہ وہ ہے جس سے اس کتاب کا آغاز ہوتا ہے اور جس کا عنوان ہے: ''ادب کا سب سے بڑا مسئلہ ادب'' اس مقالے کے دو واضح حصے ہیں۔ پہلے حصے میں کشفی صاحب نے ادب کے مفہوم، ادب کی اصطلاح، ادب کے ذریعہ اظہار ادب میں لفظ و معنی کے تعلق، ادب کے طریقہ ابلاغ،ادب کی علامتی و استعاراتی سطح، تحقیق و تنقید کے باہمی ارتباط، متن اور مخطوطوں کے مطالعے کے طریقہ کار پر بحث کی ہے۔ دوسرے حصے میں ادب اور اس کی فنی توجیہات، ادب کے بارے میں افلاطون سے لے کر آج تک کے نظریات، ان نظریات کے بارے میں ناقدین کے اختلافات و مماثلات ادب اور زندگی کے تعلق کی نوعیت حسی تجربات کی پختگی و خامی الفاظ کے ذریعے ان کے اظہار کی صورتوں کی قدر و قیمت، اس قدر و قیمت کے مختلف پیمانوں اور پیمانوں کے شخصی و غیر شخصی محرکات و مؤخرات سب پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ یہ گفتگو جیسا کہ خود کشفی صاحب نے جگہ جگہ اس کی نشاندہی کر دی ہے۔ مغربی ادیبوں کے خیالات سے ماخوذ ہے۔ لیکن سر تا سر مشرقی فضا میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ادب کی نظری بحثوں میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ ہمارے ناقدین بے سبب فلسفہ بگھارنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس قسم کی کوشش سے بات سلجھنے کے بجائے اور الجھتی چلی جاتی ہے۔واضح اندازہ ہو جاتا ہے کہ خود کہنے والے کے ذہن میں بات صاف نہیں ہے۔ دوسری جگہ سے خیالات لے لیے ہیں اور انہیں پوری طرح ہضم کیے بغیر اگلے دے رہا ہے۔ کشفی صاحب کے یہاں یہ عیب کہیں نہیں ہے۔ وہ نظری بحثوں کو محض بحثوں تک محدود نہیں رکھتے، بلکہ جا بجا مثالیں دے کر اپنے

خیالات کو مشکل کرتے جاتے ہیں۔ اس سے ان کی تحریر کو دو فائدے پہنچتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انہوں نے اپنی بات چند فقروں میں اختصار کے ساتھ کہہ دی ہے۔ دوسرے یہ کہ ادب کے قارئین کے لیے ان کا طریقہ اظہار و ابلاغ خاصا آسان و دلکش ہو گیا ہے۔

اس کتاب کا دوسرا اہم مضمون ''نگار اور اس کی روایت'' ہے۔ یہ مضمون خاصا طویل ہے اور کتاب کے چالیس صفحوں میں پھیلا ہوا ہے۔ میں نے اسے اصرار کر کے نگار کے نیاز نمبر کے لیے لکھوایا تھا۔ صرف اس لیے کہ میرے دوستوں میں وہی نگار کی علمی و ادبی روایت سے پوری طرح واقف تھے اور وہی اس کی پچاس سالہ تاریخ پر مبصرانہ نظر ڈال سکتے تھے۔ اس مضمون کا مکمل کرنا اور فروری ۱۹۲۲ء سے لے کر آج تک نگار کے مقالہ نگاروں اور مقالات کا جائزہ لینا خاصا مشکل کام تھا۔ دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ وقت اور محنت بھی چاہتا تھا۔ لیکن کشفی صاحب اپنی خوش فکری اور خوش ذوقی اور قوت تحریر کے سہارے اس مشکل سے آسان گزر گئے اور لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ کہنے کو تو اس مضمون کا تعلق نگار اور نیاز کی بناء کردہ ادبی روایت اور اس کی قدر و قیمت سے ہے لیکن کشفی صاحب نے بڑی خوبصورتی سے اس مضمون میں بیسویں صدی کے تقریباً سارے ذہنی رجحانات اور ادب و صحافت پر ان کے اثرات کو سمیٹ لیا ہے۔ مضمون کیا ہے۔ بیسویں صدی کی ادبی تاریخ کا خاکہ ہے۔ لیکن انہوں نے نگار کا سال بہ سال جائزہ محض ایک مورخ صحافی کی حیثیت سے نہیں لیا بلکہ ہر مضمون اور ہر مضمون نگار پر ناقدانہ نظر ڈال کر نگار کی ادبی رفتار کی سمت اور مضمون نگار کی علمی و ادبی صلاحیتوں کی منزل کا تعین کیا ہے۔ یہ مضمون بھی بلحاظ مواد دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ پہلے حصے میں انہوں نے نگار اور نگار سے قبل کے بعض اہم ادبی پرچوں کی روشنی میں آج کل کے ادبی پرچوں کا جائزہ لیا ہے۔ یہ جائزہ بعض مدیران رسائل کو یوں ناگوار گزرے گا کہ اس میں بہت سی سچائیاں در آئی ہیں لیکن یہ سچائیاں کشفی صاحب کے اکثر مضامین میں پائی جاتی ہیں اور ادب کے قاری کو ان سے نظر ملانا ہی پڑتی ہے۔ مضمون کے دوسرے حصے میں نگار میں ماہ بہ ماہ اور سال بہ سال چھپنے والے مضامین اور مضمون نگاروں پر تبصرے ہیں۔ یہ تبصرے بہت سی ایسی باتوں کو نگار کی پرانی فائلوں سے نکال کر از سر نو منظر عام پر لے آئے ہیں جو ہم میں سے اکثر کی نظر سے اب تک پوشیدہ تھیں۔ ان باتوں سے ایک طرف اُردو زبان کی صحافتی و ادبی تاریخ مرتب کرنے میں مدد ملتی ہے، دوسری طرف اردو ادب کی ان ارتقائی منزلوں سے شناسائی ہوتی ہے جن سے گزر کر ہمارا ادب موجودہ منزلوں تک پہنچا ہے۔

اشخاص کے سلسلے کے مضامین اس کتاب میں آٹھ ہیں۔ ان کا تعلق اکبر الہ آبادی، مولوی

عبدالحق، حسرت موہانی، امتیاز فتح پوری، مولانا حامد حسن قادری، مجاز، سید محمد جعفری اور خواجہ حسن نظامی کی شخصیت اور فن سے ہے۔ اکبر الہ آبادی اور انقلاب پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے سرسید کی تحریک اور اس کے ردعمل کی داستان کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے۔ اس جائزے کے ابتدائی جملے یہ ہیں:

''زمانے کا ساتھ دینا اور موج وقت کی رو پر بہنا زندگی کا ثبوت ہے۔ یہی زندوں کا شیوہ ہے لیکن وہ زندہ تر ہے جو طوفان میں بچھڑ جانا چاہتا ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں اکبر اور حالی اپنے جیسی الگ الگ دو سمتیں چن لیتے ہیں۔ حالی زندہ اور اکبر زندہ تر ہیں''۔

ان جملوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سرسید اور اکبر کے افکار و خیالات پر کشفی صاحب کا محاکمہ کس نوعیت کا ہوگا۔ اس محاکمے میں انہوں نے سرسید یا مولانا حالی کے ساتھ کہیں کوئی زیادتی نہیں کی وہ ان کی ملی غم خواری، ان کے خلوص ان کی دور بینی، ان کے علمی و ادبی منصب کے قائل ہی نہیں مداح ہیں۔ ایسے مداح جو ان کی بڑائی کے کسی پہلو کو بھی دبانے یا چھپانے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہاں جن لوگوں نے سرسید اور حالی کی ہمنوائی میں اکبر اور اکبر کے نقطہ نظر کو بغیر سوچے سمجھے رجعت پسندانہ قرار دیا ہے، ان پر ضرور ضرب کاری لگائی ہے۔ یہ ضرب رشید احمد صدیقی کی ضرب کی طرح کارگر ہے اور ایوان ادب اردو میں اکبر الہ آبادی کو وہ جگہ دلائی ہے جس کے وہ مستحق ہیں۔

مولوی عبدالحق، نیاز فتح پوری اور حسرت موہانی کے سلسلے کے مضامین تنقید سے زیادہ سوانحی اور تأثراتی خاکوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان خاکوں میں کشفی صاحب نے بجا بجا تنقیدی و تخلیقی رنگ ضرور بھر دیے ہیں۔ یہی رنگ حقیقتاً ان خاکوں کو ادب کے قاری کے لیے دلچسپ اور کارآمد بناتا ہے۔ ان مضامین سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کشفی صاحب نقاد کے ساتھ ساتھ ایک اچھے خاکہ نگار بھی ہیں۔ چنانچہ ذاتی تأثرات و تجربات کی روشنی میں انہوں نے ان بزرگوں کی نفسیات کی بعض ایسی گرہیں کھولی ہیں جو ان کی زندگی اور فن دونوں کے سمجھنے سمجھانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

بقیہ مضامین کی بھی کم و بیش یہی صورت ہے لیکن ان میں سوانحی رنگ کے مقابلے میں تنقیدی رنگ زیادہ گہرا ہے۔ خاص طور پر سید محمد جعفری، مجاز اور فیض کے بارے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ تنقید ہی کے ذیل میں آتا ہے لیکن دوسرے ناقدوں کے برعکس کشفی صاحب کی تنقید اُردو شاعری کی تاریخ میں ان کے مرتبے کا تعین ادب کی جمالیاتی اور زندگی کی مشرقی قدروں ہی کی روشنی

میں کرتی ہے۔ اس کتاب کا صرف ایک مضمون تحقیقی نوعیت کا ہے۔ اس کا عنوان ہے حسرت کی بعض غزلوں کا ابتدائی متن، اس مضمون کے سلسلے میں انہوں نے بعض پرانے رسالوں مثلاً مخزن، زمانہ، خیال، الناصر، اور ہمدم وغیرہ کو کھنگھالا ہے۔ حسرت کی مطبوعہ غزلیں تلاش کی ہیں۔ کلیات حسرت کے مطبوعہ نسخے سے ان کے متن کا مقابلہ کیا ہے اور حسرت نے اس میں جو اضافے یا تبدیلیاں کی ہیں ان کی نشان دہی کی ہے۔ ان اضافوں اور تبدیلیوں کے مدد سے حسرت کے فن اور ذہنی ارتقاء کو پڑھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ مضمون اس بات کا بھی سراغ دیتا ہے کہ کشفی صاحب کی ذات میں ایک محقق بھی چھپا بیٹھا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے تحقیق کو زیادہ قابل توجہ نہیں جانا اور ان کے مضامین کا بنیادی اسلوب ہمیشہ تنقیدی رہا ہے۔

☆☆☆☆☆